کردے، ذہنوں کو جلا بخشے اور قلب و ضمیر کے لئے روشنی و گرمی کا سامان مہیا کر سکے، اور ایسی زندگی کی طرح ڈال سکے جس میں اعتدال ہو، پاکبازی ہو، عفت نظر و بصر ہو، قوت ہو، اور دوسروں کیلئے ہدایت و راہنمائی کا پورا پورا سامان مہیا ہو۔ اس نفاق کی جڑ کیا ہے؟ اور کن اسباب و عوامل کا یہ نتیجہ ہے۔ اس کو معلوم کرنے کیلئے ہمیں موجودہ معاشرہ کا ذہنی تجزیہ کرنا پڑیگا۔

موجودہ معاشرہ کا تجزیہ ایک گروہ وہ ہے جسے دین سے نفیاً یا اثباتاً کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ یہ عقائد و ایمانیات سے زیادہ ... **دولت مندوں کا گروہ** اس بات کو اہمیت دیتا ہے۔ کہ زندگی کی ضروریات عاجلہ میسر ہیں یا نہیں، اس کے نزدیک بنگلہ کار اور بنک بیلنس کی تو ایک اہمیت ہے، اور اس کیلئے یہ تگ و دو میں مصروف بھی ہے، لیکن اخلاق و علوم کی اونچی اور لطیف اقدار میں اس کیلئے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ کفر و اسلام کے جھمیلوں سے یکسر آزاد ہے اور علم و روح کے تقاضوں سے کلیتہً ناآشنا، اسکے نزدیک ایک عمدہ کتاب سے کہیں بہتر ایک اچھی بوشرٹ اور چمکتا ہوا بڑھیا جوتا ہے، اسکے ہاں سینما کا کوئی گانا اور ریڈیو کا کوئی بول، ہر کلمہ حکمت اور ہر گفتگوئے دانش سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے ـــــ یہ کیوں؟ ـ اسلئے، کہ معاشرہ کی موجودہ ترتیب ہی ایسی ہے۔ جب لوگوں کے سامنے مطمح نظر نہ ہو، اونچی آرزوئیں نہ ہوں، پروگرام نہ ہو اور حصولِ دولت کی تمام راہیں، جائز و ناجائز کی تفریق کئے بغیر آزادانہ کھلی ہوں۔ اور اس پر خواہشات نفس کا غلبہ و استیلا بھی ہو۔ تو ایسے طبقہ کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے۔ اس گروہ کے پاس چونکہ دولت کی ریل پیل بہت ہے اور کسی نوع کے قومی و ملی یا دینی و علمی مقاصد زیر نظر نہیں جن پر کہ انکو خرچ کر سکیں۔ اسلئے یہ دیگر فسق و فجور ہی کا ایک مشغلہ ایسا رہ جاتا ہے، جس کی یہ سرپرستی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ـــ یہ معاشرہ کا مہلک ترین روگ ہیں اور اخلاق و دین کو سب سے زیادہ خطرہ انہیں سے ہے انکی بدعملی اور نفاق کی مضرتیں صرف انہیں کی ذات تک محدود نہیں ہیں بلکہ سارا معاشرہ اسکی لپیٹ میں آتا ہے۔ اس طبقہ کی مجرمانہ زندگی سے پوری ریاست متاثر ہوتی ہے اور نظم و نسق کا سارا کا کارخانہ افراتفری کا شکار ہو جاتا ہے رشوت، اقربا پروری اور استحصال بیجا ایسے ہولناک امراض انہیں کی بدولت زندگی کے ہر گوشے میں پھوٹ پڑتے ہیں۔ اگر یہ بداعمالیاں صرف بداعمالیاں ہی ہوتیں اور انکے اثرات دوسروں تک نہ پہنچتے، تو ان کا وجود بدرجہ مجبوری گوارا کیا جا سکتا تھا۔ افسوس اس پر ہے کہ اس طرز زندگی سے عوام میں مایوسی پھیلتی ہے، اور اخلاقی اقدار کا احترام دلوں سے اٹھ جاتا ہے، لوگ غیر شعوری طور پر یوں سوچنا شروع کر دیتے ہیں، کہ جب اتنے اونچے، اتنے آسودہ حال، اور بڑے بڑے لوگوں کے سامنے، جائز و ناجائز کی کوئی تفریق نہیں ہے جب وہ کسی اصول کو نہیں مانتے کسی اخلاقی التزام اور دینی وجوب کو تسلیم نہیں کرتے تو ہم کیوں بیوقوف بنیں۔ کیا مذہب صرف ہمیں سے اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے؟ ان سے نہیں! کیا ان لوگوں کو ایمان کی ضرورت نہیں؟ کیا ان کے دلوں میں عقبیٰ و آخرت کا ڈر کبھی کروٹ نہیں لیتا! اور کیا ان کو اپنی ذمہ داریوں کی فکر نہیں؟

عوام: دوسرا گروہ بے چارے عوام کا ہے جنھیں اوّل تو روزمرہ کی ضروریاتِ معاش ہی مہلتِ فکر نہیں دیتیں کہ وہ مذہب و دین کے بارہ میں کچھ سوچ سکیں، اور اپنے روحانی و فکری تقاضوں کو محسوس کر سکیں لیکن اگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے مذہبی احکام و اوامر کو بجالانا بھی چاہتے ہیں تو ان کے ذہن میں مذہب کا تصور صاف نہیں ہوتا۔ یہ نہیں جانتے کہ مذہب و زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ

صرف رسمیات و عباداتِ الٰہی کا نام نہیں بلکہ زندگی کا پورا نظام اس سانچہ میں ڈھلنا چاہیئے اور اسلامی نقطۂ نظر سے تو ان کی زندگی کا نہج بیّن تضاد کا حامل ہوتا ہے جس کا کہ اس کی واضح تعلیمات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں - یہ ایک طرف تو پابندی سے نمازیں پڑھتے ہیں حج کو جاتے ہیں اور زکوٰۃ و صدقات کو ادا کرتے ہیں - دوسری طرف کم تولنے، غیر خالص چیزیں بیچنے، اور چور بازاری کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے - ان کے خیال میں مذہب کی تنگ و تاز صحنِ مسجد ہی تک محدود ہے اور اس کے مطالبات زندگی کے عام کاموں میں دخل اندازی نہیں کرتے - ان کے تحت الشعور میں اسلام سے متعلق یہ عقیدہ کارفرما ہے - کہ یہ صرف نجات کا ایک ذریعہ ہے، دُنیا کی گتھیاں اس سے نہیں سلجھتیں -

جدید تعلیم یافتہ : ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو زیورِ تعلیم سے آراستہ ہے - اس کی پھر ایک تقسیم ہے - مغربی علوم و فنون پڑھے ہوئے اور قدیم عربی تعلیم پائے ہوئے - اوّل الذکر جماعت میں دو طرح کے لوگ ہیں - ایک وہ ہیں جو جدید علوم کے ساتھ ساتھ جدید اقدارِ حیات پر مٹے ہوئے ہیں اور مذہب کی معقول سے معقول تاویل و تعبیر پر بھی متوجہ ہونے والے نہیں - دُوسرے وہ جو اسلام کو دینِ حق جانتے تو ہیں، اور اس سے ایک گونہ دلچسپی بھی رکھتے ہیں، لیکن اس دلچسپی کا اظہار عمل و کردار کے گوشوں میں نہیں ہو پاتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کا مصرف یہ ہے، کہ کبھی کبھار کھانے یا چائے پر اس انداز کی گفتگو ہو جائے جس سے کہ انکی اسلامیّت پر روشنی پڑ سکے - اور یہ معلوم ہو سکے، کہ یہ لوگ اسلامی معاشرہ سے باہر نہیں ہیں -

علماء : قدیم عربی تعلیم پائے ہوئے لوگ بلاشبہ اسلام کے ساتھ مخلصانہ وابستگی رکھتے ہیں لیکن جدید تقاضوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ان میں ایک طرح کی تنگ نظری اور سطحیت ابھر آئی ہے، یہ اپنے ماحول سے ناآشنا ہیں - اس لئے نہیں جانتے کہ موجودہ دور کے تقاضے کیا ہیں اور اسلام میں فکر و عمل کے ہر ہر شعبہ میں جو نہایت ہی حسین اور معقول قسم کا توازن و اعتدال پایا جاتا ہے اسکو کیونکر موجودہ معاشرہ میں سمویا جا سکتا ہے - انکے نقطۂ نظر میں اصولی اور بنیادی خامی یہ ہے، کہ یہ اسلام کو زندگی کا لائحہ عمل قرار دینے کے بجائے مختلف مسائل و تحقیقات کا مجموعہ سمجھتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے، کہ ان کے سامنے اسلام اس طرح اپنی جامعیت اور ہمہ گیری لئے ہوئے جلوہ فرما نہیں ہے، کہ یہ ہماری روزمرّہ کی مشکلات کو حل کر سکے، ہمیں منظم اور سلجھا ہوا طریقِ حیات بخش سکے یا دنیا میں رہنے کیلئے ترقی و تہذیب کی اہم اور روشن ترین اقدار کی نشاندہی کر سکے - بلکہ ان کے ہاں اسلام کا تصوّر کچھ جزوی سا ہے اس میں کلیت کی جھلک نہیں - ایک نظام اور آئیڈیالوجی کا انعکاس بھی نہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پیش کردہ تصوّرِ زندگی اور اس کے ضروری تقاضوں سے کچھ الگ اور ہٹا ہٹا سا ہے -

آج کا ذہن : آج کا ذہن مذہب کے ایسے تصوّر پر مطمئن ہو سکتا ہے، جس میں اس کو ایک منضبط اندازِ زیست کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو - اور ہر ہر موضوع کو مناسب و موزوں اہمیت دی گئی ہو - یعنی جس میں عمرانی و تہذیبی تقاضوں کے مقابلہ میں ایک متعین اور قابلِ عمل موقف کی تشریح کی گئی ہو، جس میں اسکے سیاسی رجحانات کی مکمل وضاحت ہو، جس کا سادہ اور واضح فلسفہ ہو جو انسانیت کے موجودہ امراض کے علاج پر قادر ہو - اور جو موجودہ معاشرہ کو مطلوبہ روحانی و مادی بلندیوں سے ہمکنار کر سکے -

اگر معاشرہ کا محولہ بالا تجزیہ صحیح ہے تو اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ بحیثیت مجموعی مسلمان پورے اور کامل اسلام کے ساتھ وابستگی نہیں رکھتے۔ اسباب چاہے کچھ ہوں یہ حقیقت ہے کہ اس اسلام کے ساتھ جو واضح اور جامع اقدار حیات رکھتا ہے تعلق یا تو برائے نام ہے، یا بالکل جزوی ہے؟ یہی وجہ ہے۔ کہ اسلام اسلام پکارنے کے باوجود اس کی برکات سے مسلمان یکسر محروم ہیں ـــ سوال یہ ہے کہ یہ تو ہوا مرض، اس کا علاج کیا ہے؟ کیونکر مسلمان اس آیت کے منشار کو پورا کر سکتے ہیں، اور کیونکر ادخلوا فی السلم کافۃ کا صحیح صحیح مصداق ہو سکتے ہیں ـــ جواب بہت سادہ ہے۔ سب سے پہلے تو اس کی نئی تعبیر ضروری ہے جو اس کے پرانے ڈھانچہ کو بدل دے، اور اس کے لئے نیا پیرایہ بیان، نیا انداز استدلال، اور نئی ترتیب مسائل مہیا کرے ـــ پھر اس کے مطابق یہ ضروری ہے، کہ تعلیم و تربیت کے سانچے بھی بدلیں تاکہ ایمانیات کے بارہ میں جو بے یقینی اور بے رغبتی سی پائی جاتی ہے وہ دور ہو، اور اس کی جگہ ایقان و اذعان کی استواریاں دلوں میں جاگزیں ہوں۔ اسلام کے ساتھ پوری پوری دلچسپی پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے، کہ معاشرہ میں جو اقتصادی ناہمواریاں، اور اخلاقی برائیاں ہیں، ان کو بھی دور کیا جائے اور دولت و ثروت کو ذریعہ عیش سمجھنے کی بجائے۔ یہ سمجھا جائے، کہ یہ محض ملی و اجتماعی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہے ـــ دوسرے لفظوں میں جب تک پبلسٹی اور اشاعت کے تمام ذرائع کو ہم اس غرض کے لئے وقف نہیں کر دیتے، کہ لوگوں میں صحیح تصورات پیدا ہوں، اور لوگ مادی آسائشوں کے مقابلہ میں بہرحال روحانی و اخلاقی اقدار کی اہمیت زیادہ محسوس کریں۔ اس وقت تک پورے پورے اسلام سے ہمارا معاشرہ بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ اجتہاد

(مصنفہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی) اس میں اس موضوع سے بحث کی گئی ہے کہ قیاس و تعلیل کے وہ کون کون منبے ہیں، جن پر فقہ اسلامی کا قصر جمیل تعمیر ہوا ہے۔ یعنی قرآن حکیم کا کیا موقف ہے؟ اور اس سے استفادہ کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ حدیث و سنت کو ہمارے آئمہ نے کیا اہمیت دی ہے۔ اور اجماع، تعامل اور اجتہاد کے حدود کہاں سے کہاں تک ہیں۔ مزید برآں جدید ترین تقاضوں کے ماتحت اگر فقہ جدید کی تدوین کی جائے، تو وہ کون سے مستند اصول ہو سکتے ہیں۔ جن کا اس سلسلہ میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ضمناً بیسیوں علمی مضامین آ گئے ہیں، اور ایسی ایسی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے کہ بہت ہی کمتر اسکی مثال دوسری کتابوں میں ملیگی۔ سب سے بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اسکے پڑھنے سے فقہ اسلامی کا پورا ڈھانچہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور وضاحت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ اسلام کا فقہی نظام کن گہرائیوں اور نزاکتوں کا حامل ہے؟ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۔۲۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ (پاکستان)

محمد جعفر شاہ ندوی

ایک حدیث

حضرت عبداللہ عمرو بن العاص سے بخاری میں ایک روایت یوں مروی ہے :

ثلثة انا خصمهم يوم القيامة، رجل اعطى بى ثم غدر، و رجل باع حرًّا ثم اكل ثمنه و رجل استأجر اجيرا فاستوفى منه العمل ولم يوف اجره .

تین طرح کے آدمیوں کا میں بروز حشر مخالف ہونگا، ایک وہ شخص جو مجھ سے معاہدہ کرے اور پھر عہد شکنی کرے۔ دوسرے وہ جو کسی آزاد کو بیچ کر اس کے دام کھا جائے۔ تیسرے وہ جو کسی مزدور سے معاملہ طے کر کے اس سے کام تو پورا لے اور مزدوری پوری نہ دے۔

معاہدے کی پابندی کے متعلق تو اتنے احکام ہیں کہ ان سب کو یکجا کر کے پیش کرنا خود ایک طویل مقالے کا طالب ہے معاہدے کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کے متعلق قرآن کریم میں بھی بہت سے احکام ہیں اور احادیث میں بھی۔ قرآن کریم میں ہے :

... فما استقاموا لكم فاستقيموا لهم

جب تک وہ معاہدے پر قائم رہے تم بھی اس پر قائم رہو۔

واما تخافن من قوم خيانة فانبذ هم على سواء

اگر تمہیں کسی قوم سے عہد شکنی کا یقینی خطرہ پیدا ہو جائے تو تم وہ عہد نامہ برابری کے اصول پر ان کے آگے ڈال دو۔

برابری کے اصول کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ معاہدے کی جس دفعہ کو جس حد تک توڑے تم بھی اسی دفعہ میں اور اسی حد تک اس کو جواب دو۔ اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ : ان الغادر ينصب له لواء يوم القيامة فيقال هذه غدرة فلان (شیخین، ابو داؤد، ترمذی عن ابن عمر)

یعنی بدعہدی کرنے والے کیلئے بروز حشر ایک جھنڈا نصب کیا جائیگا اور یہ بتایا جائیگا کہ یہ فلاں کی بدعہدی کا نشان ہے۔

یہ سب باتیں درست ہیں لیکن عہد یا معاہدہ یا میثاق صرف وہی نہیں ہوتا جو دو قوموں کے درمیان ہو سب سے بڑا اور پہلا میثاق وہ ہے جو بندہ اپنے رب سے کرتا ہے۔ یہ میثاق ایک اقرار ہے کہ میں تیرا بندہ، عبد اور غلام ہوں اور تو میرا الٰہ، رب اور حاکم و آقا ہے۔ اسے عهد الله کہتے ہیں (و ينقضون عهد الله) اور جس نوشتے کے ذریعے یہ عہد پختہ کیا جاتا ہے اس کا نام میثاق ہے۔ یہ وہ کتاب یا ہدایت نامہ ہے جو بذریعہ وحی انبیاء علیہم السلام لاتے ہیں۔ توریت کو عہد نامۂ قدیم اور انجیل کو عہد نامۂ جدید اسی لئے کہتے ہیں۔ یہ ساری کتابیں میثاق ہیں جو ہر مخصوص قوم کے لئے ذریعہ عہد تھیں اور اب اُمت محمدیہ کے لئے ـــ جس کے بعد کوئی اُمت نہیں ـــ قرآن آخری میثاق اور عہد نامہ ہے۔

قومی عہد شکنی کے لئے نبذ کا لفظ آتا ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے فانبذ هم على سواء اسی طرح عبد و معبود کے درمیان جو معاہدہ ہے

اسے توڑنے کی شکل کسی کتاب اللہ کو چھوڑ دینا ہے اور اس کے لئے بھی یہی نبذ کا لفظ آیا ہے مثلاً: فنبذوہ وراء ظھورھم (ان اہلِ کتاب نے میثاق کو پس پشت ڈال دیا)۔ نبذ فریق من الذین اوتوا الکتب کتب اللہ وراء ظھورھم (اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا)۔

اب دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدہ کیا جائیگا وہ دو طرح کا ہوگا، یا تو وہ کوئی قومی معاہدہ ہوگا جو غیر مسلم کریگا، یا یہ وہ معاہدہ ہوگا جو مسلمان کریگا۔ حضورؐ نے کبھی کسی ایسے شخص کو معاف نہیں فرمایا جس نے معاہدہ کرکے توڑا ہو یا کتاب اللہ کو چھوڑا ہو۔ حضورؐ نے منافقوں تک کے لئے دعا فرمائی ہے لیکن عہد شکنی کرنیوالوں کیلئے نمازوں کے اندر بھی بددعا فرماتے رہے۔ رہے کتاب اللہ کو چھوڑنے والے تو انکے متعلق قرآن کی یہ آیت کبھی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتی کہ: قال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا ۵ (رسول بروز حشر یہ فریاد کریگا کہ بار الٰہا میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا)۔

اب ذرا زیر بحث حدیث سے اس آیت کو ملایئے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ میں تین طرح کے آدمیوں کا بروزِ حشر مخالف ہوں گا جن میں ایک وہ ہے جو مجھ سے عہد کرکے غداری و عہد شکنی کرے مسلمان کا عہد و میثاق کتاب اللہ یعنی قرآن ہے اور اس سے غداری کرنے والے کے لئے رسول اللہؐ شفاعت نہیں فرمائیں گے بلکہ اسکے خلاف بارگاہ ایزدی میں استغاثہ دائر کرینگے۔ (اعاذنا اللہ منہم) اگر ہمارا نظام زندگی کسی ایسی بنیاد پر تعمیر کیا جائے جو کتاب اللہ کے خلاف ہو تو وہ تمام لوگ اس وعید کی زد میں آئیں گے، جو غیر قرآنی نظام کی تعمیر کے ذمے دار ہوں علی حسب مراتب۔

دوسرا شخص جس کے حضورؐ مخالف ہونگے وہ ہے جو کسی آزاد یا حر کو بیچ کر اس کے دام کھا جائے۔ دراصل ہر انسان حر ہی پیدا ہوا ہے اور حریت اس کا پیدائشی حق ہے۔ یہ اتفاقی حادثہ ہے، کہ کوئی انسان جنگ میں قید ہو جاتا ہے اور فدیہ رہائی ادا ہونے تک وہ کسی کے ہاتھ گرو رہتا ہے۔ اس حالت قید میں بھی اسے بعض وہ رعایتیں حاصل ہوتی ہیں جو حر کو حاصل نہیں ہوتیں مثلاً وہ گھر کا ایک ایسا رکنِ خاندان ہو جاتا ہے کہ اس سے پردہ نہیں ہوتا ... او ما ملکت ایمانھن ... (۳۱:۲۴) اسی مجبور انسان کو لوگ غلام کہتے ہیں اور اسلام نے تدریجی طور پر اس رسم کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ اب کسی شخص کو پکڑ کر بیچ ڈالنا اور اس کے دام ہضم کرنا اتنا بڑا جرم ہے جس کے عوض حضورؐ بروز حشر مخالف ہوں گے۔ اب وہ قدیم رسم غلامی تو ختم ہو گئی ہے لیکن سہ

بدل کے بھیس یہ آتے ہیں ہر زمانے میں ‏ ‏ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

اب ملک اور قوم غلام بنائے جاتے ہیں اور ایک لیڈر پوری کی پوری قوم یا ملک کو کسی کے ہاتھ تیرہ پونجی کے عوض بیچ ڈالتا ہے اس طرح اسکی حریت فروخت ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ بھی زیر بحث حدیث کی وعید سے بچ نہیں سکتے

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو مزدور سے محنت تو پوری لیتے ہیں لیکن انکو معاوضہ پورا نہیں دیتے حضورؐ بروز حشر انکے بھی مخالف ہونگے یہ بڑی دردناک داستان ہے اور دنیا میں ایک طبقہ ہمیشہ سے اس کا مرتکب ہوتا آیا ہے اس ذیل میں صرف یہی نہیں کہ ایک شخص سے اگر کسی کام کا معاوضہ ایک روپیہ ٹھہرا ہے تو اسے پندرہ آنے دیئے جائیں بلکہ یہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے کہ وہ اصل وہ دو روپے کا

کام ہو اور اس کی مجبوری و بے کسی سے فائدہ اُٹھا کر ایک ہی روپیہ پر معاملہ طے کر لیا جائے اور ایک روپیہ اسے دے دیا جائے سُود کیوں حرام ہے؟ صرف اس لئے کہ کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ مجبور اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی مدد کی بجائے نہ یہ کہ اسے (EXPLOIT) کیا جائے۔ ایک محنت کش کے لئے تو اتنا بھی حضور کو گوارا نہ تھا کہ اس کی مزدوری ادا کرنے میں تاخیر سے کام لیا جائے۔ حضور نے فرمایا: اعطوا الاجیر اجرتہ قبل ان یجف عرقہ (مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی مزدوری دے دو)

سوچئے کہ جس پیغمبر کو واسطے اجرت میں تاخیر بھی گوارا نہ ہو اسے مزدوری کی تخفیف کیونکر گوارا ہوگی؟ محنت پوری لے کر اُجرت میں کمی کرنا یا شروع ہی میں مزدور کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مزدوری کم طے کرنا اور بعد میں مزدوری پوری لینا ایک ایسی خود غرضانہ حرکت ہے جسے قرآن نے تطفیف کہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون ۝

بربادی ہے ان کمی کرنے والوں کی کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں۔

دُوسروں سے پورے تول ناپ سے لینا اور خود ڈنڈی مارنا دراصل ایک نفسیاتی و اخلاقی مرض ہے۔ یہ وہی کرے گا جو خود غرض ہے یہ محض ترازو بٹے کا قصہ نہیں، یہ ایک خود غرضانہ رجحان ہے جو پوری زندگی کو متاثر کرتا ہے زندگی کے سارے شعبے ـــ اخلاقی، سیاسی، ملکی، قومی، تجارتی، تعلیمی غرض تمام شعبے ـــ اس سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر جگہ بے عدلی و عدم توازن اپنے فطری بگاڑ سے جو ہر معاشرہ کو برباد کر دیتا ہے۔ اس میں رجحان ہوتا ہے نفع اندوزی کا، اس میں میلان ہوتا ہے ایسی خود غرضی کی طرف جو کسی کے نفع نقصان کی پروا نہ کرے۔ سیدنا شعیب کی پوری قوم اسی عیب کی وجہ سے برباد ہو گئی اور اسی اخلاقی جرم سے قرآن نے بار بار روکا ہے۔ یہی میلان و رجحان جب کسی مزدور سے معاملہ کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس غریب سے کام پورا لیا جاتا ہے اور مزدوری کم دی جاتی ہے یا اسے مجبور دیکھ کر مزدوری کم طے کی جاتی ہے اور محنت پوری لی جاتی ہے۔ اس تطفیف کو حضور کیونکر گوارا فرما سکتے تھے؟

ان تینوں قسم کے لوگوں میں ایک خاص قسم کی نفسیاتی مناسبت ہے اسی لئے حضور بروز حشر ان تینوں قسم کے لوگوں سے بیزار اور ان کے مخالف ہونگے۔ یہ تینوں قسم کے لوگ وہ ہیں جو کسی کو کمزور دیکھ کر بے بس پا کر مجبوری کو بھانپ کر اسکی بیچارگی سے ظالمانہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ عہد شکنی بھی عموماً وہی کرتا ہے جو سمجھتا ہے کہ معاہد اتنا کمزور ہے کہ ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ یوں ہی کسی حر شخص کو پکڑ کر وہی فروخت کر سکتا ہے جو اس بے چارے کو کمزور و بے بس پائے۔ اور اسی طرح کسی مزدور کی مزدوری میں زیادتی کریگا۔ جو اسے مجبور و بے بس سمجھتا ہو ـــ دُوسرے لفظوں میں اس پوری حدیث کی اسپرٹ یہ ہے کہ حضور ہر اس ظالم کے خلاف ہونگے جو کسی مجبور کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھائے، اور اسکے نقصان کی پرواہ کئے بغیر اپنا نفع حاصل کرتا چلا جائے۔ یہ تمام قسم کی حرکتیں کرنے کے بعد بھی یہ آسرا لگائے رکھنا کہ حضور ہماری شفاعت فرمائیں گے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر بحث فرمان سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ ایسے لوگوں کی حضور سفارش نہیں فرمائیں گے بلکہ ان کے خلاف ہوں گے۔

سوال وجواب :

ایک اجازت کی صراحت

کراچی سے اکبر علی صاحب نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ "... آپ کا ماہنامہ ثقافت جہاں اور بہت سی خوبیوں کے لئے قابلِ تعریف ہے وہاں اس کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں عورتوں کے متعلق بہت مفید اور اہم مسائل پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں ایک ایسا سوال کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جو بہت عرصہ سے کھٹک رہا ہے اور کہیں سے اس کا تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ سوال یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں، وہ نہ صرف مردوں کے برابر ہیں بلکہ بعض حقوق تو مردوں سے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن میں ایک جگہ عورتوں کو مارنے کا بھی حکم ہے، یہ حکم مساواتِ مرد و زن اور حقوقِ نسواں کے اسلامی تصورات کے مطابق کیونکر ہو سکتا ہے اگر عورتوں کو بھی یہ حق دیا جاتا تو مساوات ہوتی لیکن یہ حکم تو یک طرفہ ہے۔ عورتوں کی کمزوری کا تقاضا تو یہ تھا کہ مردوں کو مار پیٹ کرنے سے روکا جاتا نہ کہ اس کا حکم دیا جائے۔ کیا آپ اپنے رسالہ میں اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈال کر ہمارے شکوک دور فرمائیں گے؟"

ثقافت: یہ سوال صرف آپ ہی کے ذہن میں نہیں آیا بلکہ بہت سے مردوں اور عورتوں کے دل میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے چنانچہ ادارہ کی بعض مطبوعات میں بھی اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ ہم اسی جواب کو یہاں نقل کرتے ہیں جو انشاء اللہ آپ کو اور دوسرے بھائی بہنوں کو بڑی حد تک مطمئن کر دے گا :-

.... والّتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن فان اطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلا ط ان اللہ کان علیا کبیرا ہ (۴ : ۳۴)

اور جن عورتوں سے تمہیں "نشوز" کا خطرہ ہو تو ان کو نصیحت کرو اور ان کو ان کی خوابگاہوں میں چھوڑ دو اور ان کو مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف کوئی اور راستہ نہ تلاش کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی بلند اور بڑا ہے۔

اس آیت میں بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو مارنے پیٹنے کی اجازت دے کر انھیں اور بھی کمزور و بے بس کر دیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی ظاہری شکل اگرچہ ایسی ہی نظر آتی ہے لیکن اس کی روح یہ ہے کہ لفظوں میں مارنے کی اجازت دیکر معنیً اس حق کو مردوں سے سلب کر لیا گیا ہے۔ پہلے ایک روایت سن لیجئے جو سنن ابی داؤد میں ایاس بن عبداللہ بن ابی ذباب سے مرفوعاً مروی ہے:

لا تضربوا اماء اللہ۔ فجاء عمر الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم فقال ذأرن النساء علے